جلیبیاں

احمد ندیم قاسمی



شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز ۰ ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

جملہ حقوق کی اجازت لی گئی ہے۔
کسی ادارہ یا رسالہ کو کہانی شائع کرنے کا حق نہیں!

پیارے بچّو!

پہلے آپ مُنہ بولتی کہانی کے عُنوان سے ہلکی پھُلکی کہانیوں کی سِلسلہ وار سیریز خوب چٹخارے لے کر پڑھ چکے ہیں —— لیجیے! اب عجوبہ کہانی کے عُنوان کے تحت پہلے کی نسبت ذرا مشکل الفاظ میں ہمارے بزرگ ادیبوں کی کہانیوں کا نیا سلسلہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ عجوبہ کہانیاں آپ کو ایک نئی سوچ دیں گی —— ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ہمارے بزرگ ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے آپ کے لیے خوبصورت انداز میں پیش کر کے اُسی طرح لوٹا دیں۔ یہ کہانیاں آج بھی آپ اُسی طرح پسند کریں گے، جس طرح کہ پچاس سال پہلے ہمارے بزرگوں نے اِنھیں پڑھا اور پسند کیا اور ان کے ذہنوں میں نقش کر گئیں انشاءاللہ آپ بھی پڑھیں گے تو اسی طرح کا لطف اُٹھائیں گے۔

اِن کہانیوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا، جو ہمارے لیے اور خاص کر آپ کے لیے ایک وراثت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج یہ وراثت ہم آپ کو ایک خوبصورت انداز میں لوٹا رہے ہیں۔ کہانیوں کو یکجا کتابی صورت میں کرتے وقت انتہائی مجبوری کے تحت دوسرے ساتھی ادیبوں کی کہانیاں بھی کتاب میں شامل کرنا پڑیں جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ البتہ ہر کہانی کے ساتھ ان کا اسمِ گرامی اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ آخر میں ان ادیبوں اور جو بزرگ ادیب ہم میں موجود نہیں، اُن کے لواحقین کی تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے اِس قیمتی تحفہ کو آپ تک پہنچانے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ خاص طور پر محترم رب نواز ملک کا بھی جن کے دلی تعاون سے یہ کہانیوں کا خوبصورت گلدستہ آپ تک پہنچا۔

شیما مجید



مرتّبہ
شیما مجید

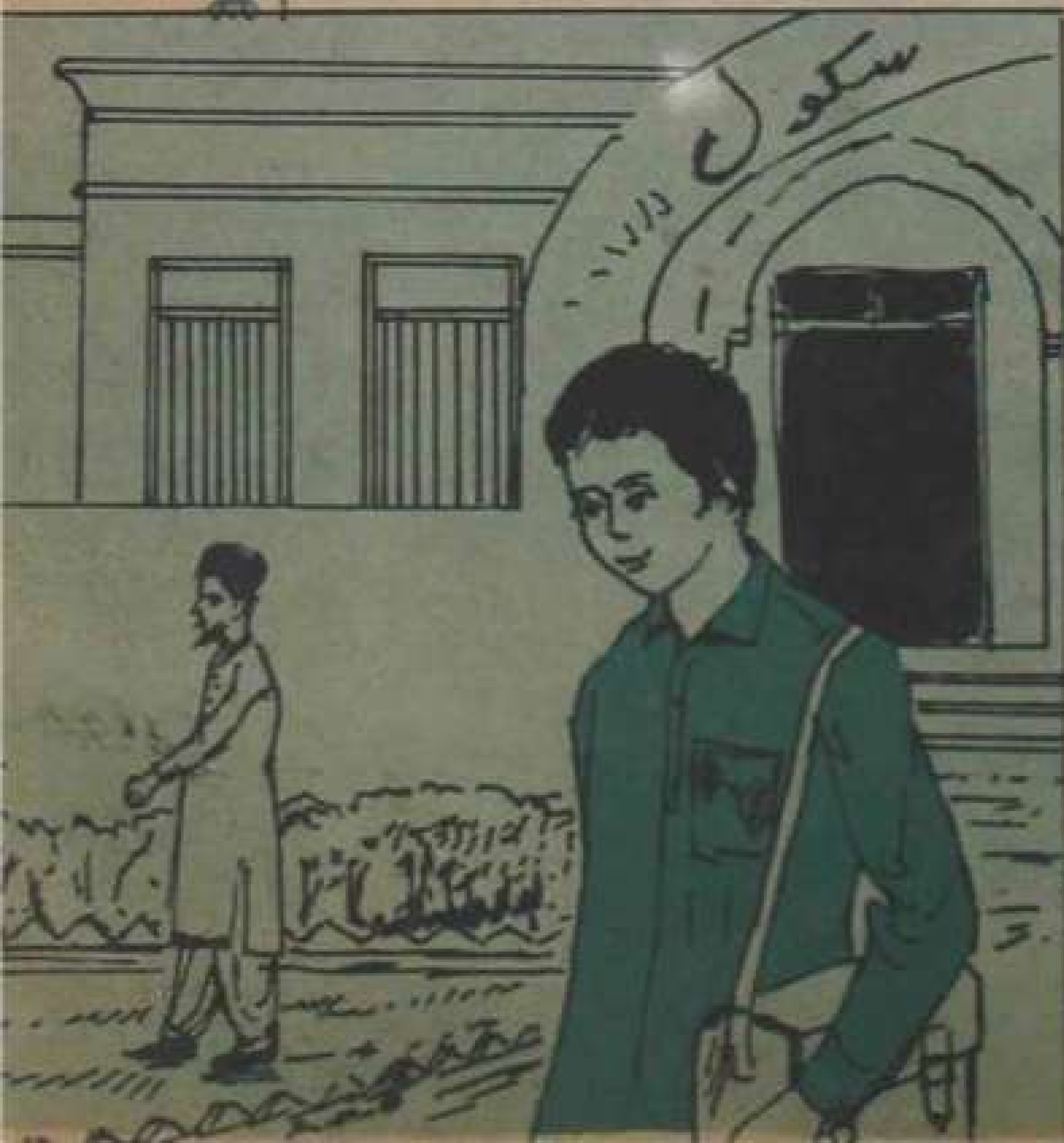
مُنہ بولتی کہانی 9

قیمت = /۸ روپے

احمد ندیم قاسمی

جلیبیاں

یہ آج سے کوئی ۶۴ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ہم گورنمنٹ سکول کیمبل پور میں جماعت پنجم کے طالبعلم تھے۔ ایک دن گھر سے فیس اور فنڈز کے مبلغ چار روپے لے کر سکول پہنچے تو پتہ چلا کہ آج فیس وصول کرنے والے ماسٹر غلام محمد چھٹی پر ہیں، لہٰذا فیس کل لی جائے گی۔ دن بھر تو یہ چار روپے ہماری جیب میں چپ چاپ پڑے رہے۔ مگر جب ہم چھٹی کے بعد سکول سے باہر نکلے تو یہ روپے بولنے لگے۔



ٹھیک ہے، روپے بولتے نہیں ہیں۔ بجتے ہیں یا کھنکتے ہیں۔ مگر بھائی تم یقین کرو کہ اُس روز تو وہ بولے۔ بلکہ آپ کی طرح میں خود بھی حیران تھا۔

ایک روپیہ کہنے لگا :

" سوچتے کیا ہو؟ سامنے کی دکان پر کڑھاؤ میں سے جو تازہ تازہ جلیبیاں نکل رہی ہیں تو یوُں ہی تو نہیں نکل رہی ہیں۔ جلیبی کھانے کی چیز ہے اور اسے وہی لوگ کھاتے ہیں جن کی جیب میں روپے ہوتے ہیں اور روپے یوُں ہی تو نہیں ہوتے، روپیہ تو خرچ کرنے کی چیز ہے اور اسے وہی لوگ خرچ کرتے ہیں جنھیں جلیبیاں اچھی لگتی ہیں۔"

ہم نے کہا :

" دیکھو بھائی چار روپو! ہم بڑے اچھے لڑکے ہیں، اور تم ہمیں گمراہ نہ کرو، ورنہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ گھر میں ہمیں اِتنا کچھ کھانے کو مِل جاتا ہے کہ بازار کی چیزوں کی طرف ہم دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ پھر تم ہماری فیس اور فنڈ کے روپے ہو۔ آج ہم تمھیں خرچ کر بیٹھیں گے تو کل سکول میں ماسٹر غلام محمد اور اس کے بعد قیامت کے دن اللہ میاں کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔ تم شاید



نہیں جانتے کہ ماسٹر غلام محمد خفا ہو کر اگر کسی کو بنچ پر کھڑا کرتے ہیں تو پھر چھٹی کی گھنٹی بجنے تک اُسے بٹھانا بھول جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم ہمارے کان نہ کھاؤ بھائی! اور ہمیں سیدھا گھر جانے دو۔"

روپوں کو ہماری یہ بات اِتنی بُری لگی کہ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ ایک دم اتنا شور مچا کہ بازار میں سے گزرنے والے لوگ ہماری طرف اور ہماری جیب کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اُن دنوں کا روپیہ کم بخت بجتا بھی تو بہت زیادہ تھا۔ آخر گھبرا کر ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چاروں روپوں کو اپنی مُٹھی میں جکڑ لیا تو وہ چُپ ہو گئے۔

چند قدم چلنے کے بعد ہم نے اپنی اُنگلیوں کو ذرا سا ڈھیلا کیا تو سب سے پُرانا روپیہ بولا:

"ہم تو تمھارے ہی بھلے کی بات کر رہے ہیں، مگر تم ہو کہ ہمارا ٹینٹوا دبائے بیٹھے ہو۔ سچ سچ بتاؤ، کیا تازہ تازہ اور پھر گرم گرم جلیبیاں کھانے کو تمھارا



اپنا جی نہیں چاہ رہا ہے ؟ پھر اگر آج تم ہمیں خرچ کر بیٹھو گے تو کیا کل تمھیں وظیفے کی رقم نہیں ملے گی ؟ آج فیس کے روپوں کی مٹھائی کھا لو، اور کل وظیفے کے روپوں کی فیس ادا کر دینا۔ قِصّہ ختم پیسہ ہضم۔"

ہم نے انھیں سمجھاتے ہُوئے کہا :

"تم جو بات کہہ رہے ہو وہ ٹھیک بات نہیں ہے، مگر کچھ ایسی غلط بات بھی نہیں ہے۔ ایک بات مانو، تم اپنی بَک بَک ذرا بند کرو اور ہمیں ذرا دیر تک اِس بارے میں سوچنے دو۔ ہم کوئی ایسے ویسے لڑکے نہیں ہیں۔"

پُرانا روپیہ پھر بولا :

"ٹھیک ہے، تم ایسے ویسے لڑکے نہیں ہو، مگر تم یہ مت بھُولو کہ یہ جلیبیاں بھی کوئی ایسی ویسی جلیبیاں نہیں ہیں۔ یہ بالکل تازہ ہیں اور پھر میٹھے میٹھے رس سے بھری ہُوئی ہیں۔"

مُنہ میں پانی تو بھر آیا۔ مگر ہم اِس سیلاب میں آسانی سے



بہہ جانے والے نہیں تھے۔ سکول میں ہم بڑے ہونہار بچوں
میں گنے جاتے تھے۔ چوتھی جماعت کے امتحان میں تو ہم
نے چار روپے مہینے کا وظیفہ بھی جیتا تھا۔ اِس کے علاوہ ہم
ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھر سے سکول آتے تھے۔
اس لیے ہمارے بڑے ٹھاٹ تھے۔ اب تک سکول میں
کبھی پٹے نہیں تھے بلکہ ماسٹر جی نے کئی لڑکوں کو ہم سے پٹوایا
تھا۔ اِتنے رُعب داب والا بچّہ بازار میں کھڑے ہو کر جلیبیاں
کھانے لگے ؟ نہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ بات ہرگز ٹھیک
اور مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ روپوں کو ہم نے خوب زور سے
مُٹھّی میں دبایا اور جلدی جلدی گھر آ گئے۔

اس روز تو روپوں کو خرچ ہونے کا کچھ ایسا شوق تھا کہ
بس کچھ نہ پوچھو، باتیں کرتے کرتے
ان کی آوازیں بھرّا گئیں۔ ہم گھر
جا کر پلنگ پر بیٹھے تو وہ بولنے
لگے۔ ہم کھانا کھانے چلے تو وہ
چیخنے لگے۔ ہم نے بستر پر لیٹ
کر کروٹیں بدلنا شروع کیں، تو



وہ رونے لگے۔

تنگ آ کر ہم اُٹھے اور ننگے پاؤں بازار کی طرف بھاگ نکلے۔ گھبرائے ہُوئے تو تھے ہی، حلوائی کو اکٹھی ایک روپے کی جلیبیاں تولنے کو کہہ دیا۔

حلوائی نے حیران ہو کر، ہماری طرف یُوں دیکھا جیسے کہ وہ پُوچھ رہا ہے، کیوں میاں! اِتنی جلیبیاں لادنے کے لیے ریڑھی کہاں ہے؟

وہ بڑا سستا زمانہ تھا۔ ایک روپے کی اتنی جلیبیاں ملتی تھیں جو اب بیس روپے میں بھی نہ ملیں۔ حلوائی نے ایک پُرانا اخبار کھولا اور اس پر جلیبیوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔

ابھی ہم یہ ڈھیر سمیٹ ہی رہے تھے کہ دُور سے ہمیں اپنا ٹانگہ آتا دکھائی دیا۔ ہمارے چچا جان کچہری سے واپس آ رہے تھے۔ ہم جلیبیوں کے ڈھیر کو اپنے سینے سے چمٹائے ایک قریب کی گلی میں گھُس گئے۔

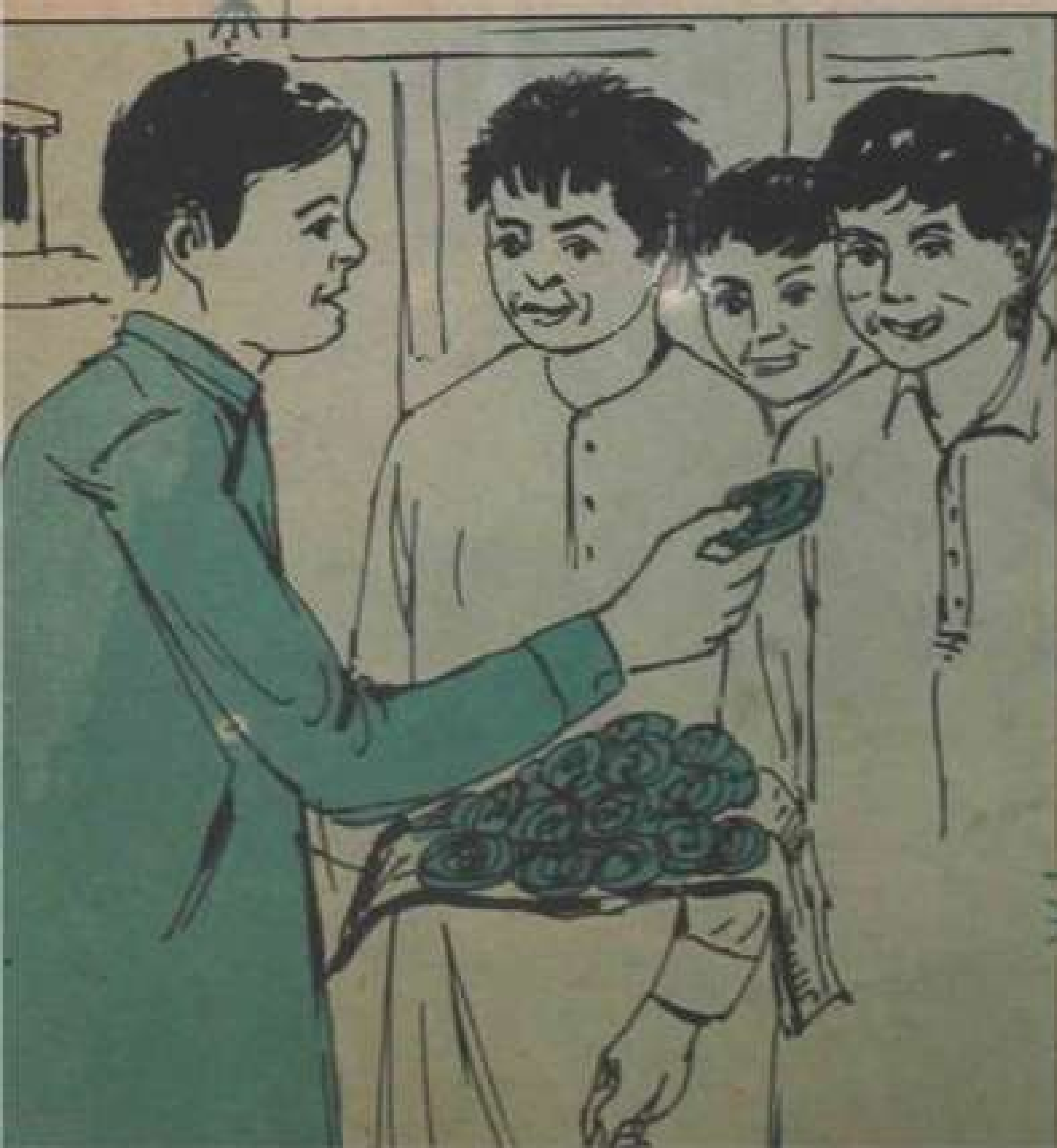
ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر جو



ہم نے جلیبیاں کھانا شروع کیں تو اِتنی کھائیں، اِتنی کھائیں کہ اگر اس وقت کوئی ہمارے پیٹ کو ذرا سا دبا دیتا تو جلیبیاں ہمارے کانوں اور نتھنوں میں سے لٹک پڑتیں۔

گلی میں محلّے بھر کے لڑکے ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔

ہم جلیبیاں کھا کر سیر تو ہو ہی چکے تھے، اس لیے موج میں آگئے اور ایک ایک جلیبی ان کو بھی تھما دی۔ وہ خوش ہو کر کُودتے اور چلّاتے ہُوئے اِدھر اُدھر گلیوں میں بھاگ گئے، مگر شاید انہی سے یہ خوش خبری سُن کر نئے بچّے اِدھر آ نکلے۔ ہم نے لپک کر حلوائی کی دکان سے ایک روپے کی اور جلیبیاں خریدیں اور واپس آ کر ایک مکان کے چبوترے پر کھڑے ہو کر ساری جلیبیاں یوں بچوں میں بانٹ دیں، جیسے یومِ آزادی پر گورنر صاحب غریبوں اور مسکینوں میں چاول بانٹا کرتے تھے۔ اب تک ہمارے ارد گرد بچّوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا اور



گداگروں نے بھی ہلہ بول دیا تھا۔ اگر بچّے بھی اسمبلی کے ممبر بن سکتے تو اُس دن ہماری کامیابی یقینی تھی۔ اس لیے کہ یہ ہجوم ہمارے جلیبی والے ہاتھ کے ایک ذرا سے اشارے پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا۔

ہم نے باقی دو روپوں کی بھی جلیبیاں خرید کر بانٹ دیں۔ اس کے بعد نل پر آ کر ہاتھ مُنہ دھوئے اور یوں مسمسی صُورت بنائے گھر واپس آ گئے، جیسے ہم نے جلیبی کی صُورت عُمر بھر نہیں دیکھی۔ کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

جلیبیاں تو ہم نے کھا لیں مگر انھیں ہضم کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ ہر سانس کے ساتھ ڈکار آ رہی تھی اور ہر ڈکار کے ساتھ ایک آدھ جلیبی کے باہر نکل پڑنے کا ڈر مارے جا رہا تھا۔

شام کے بعد مارے باندھے کھانا بھی کھانا پڑ گیا۔ اگر ہم نہ کھاتے تو نہ کھانے کی وجہ پوچھی جاتی اور اگر بیماری کا بہانہ کرتے تو ڈاکٹر بلوا لیا جاتا اور اگر ڈاکٹر



ہماری نبض دیکھ کر کہہ دیتا کہ مُنّا جلیبیوں کا ایک ڈھیر ڈکارے پڑا ہے تو جان پر بن جاتی۔

نتیجہ یہ نِکلا کہ ہم ساری رات پیٹ کے درد کے مارے اپنے بستر پر جلیبی بنے پڑے رہے۔ وہ تو خدا کا شُکر ہے، کہ چاروں روپوں کی جلیبیاں ہمیں کو نہیں کھانا پڑی تھیں۔ ورنہ دُوسرے بچّے تو جب باتیں کرتے ہیں تو اُن کے مُنہ سے پھُول جھڑتے ہیں، لیکن ہم دُنیا کے پہلے بچّے ہوتے، جس کی ہر بات پر اُس کے مُنہ میں سے ایک عدد تلی تلائی اور گرما گرم جلیبی ٹپک پڑتی۔

بچّوں کے معدے ایسے ویسے نہیں ہوتے۔ ہاضمے کی مشینیں ہوتی ہیں، سو صُبح تک ہماری مشین بھی چالُو رہی اور ہم روز کی طرح مُنہ دھو کر ایک چاق و چوبند طالب عِلم کی طرح اسکول کی طرف چل دیے۔



ہمیں معلوم تھا کہ آج پِچھلے مہینے کا وظیفہ مِل جائے گا اور اس رقم سے فیس ادا کر کے ہم

جلیبیوں کو پوری طرح ہضم کر لیں گے، مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ اِس مہینے کا وظیفہ تو اگلے مہینے ملے گا، یہ سُن کر ہمیں تو چکّر آ گیا، ایسا لگا جیسے ہم سَر کے بَل کھڑے ہیں اور اب چاہیں بھی تو پاؤں کے بَل کھڑے نہیں ہو سکتے۔

ماسٹر غلام محمد نے بتایا کہ تفریح کے گھنٹے میں فیس لی جائے گی۔ تفریح کی گھنٹی بجی تو ہم بستہ بغل میں دبائے چُپکے سے اسکول سے باہر نکلے اور ناک کی سیدھ میں یُوں چلنے لگے جیسے اگر ہماری راہ میں کوئی پہاڑ یا دریا نہ آیا تو ہم ہمیشہ یونہی چلتے رہیں گے اور جب ہم وہاں پہنچیں گے، جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے تو وہاں ہم اپنے اللہ میاں سے کہیں گے کہ اللہ میاں! اب سے ہماری توبہ، بس اب کے ہمیں بچا لیجیے اور کسی فرشتے کو حکم دیجیے کہ وہ آ کر ہماری جیب میں صِرف چار روپے ڈال جائے۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اِن چار روپوں سے فیس ہی ادا کریں گے، جلیبیاں



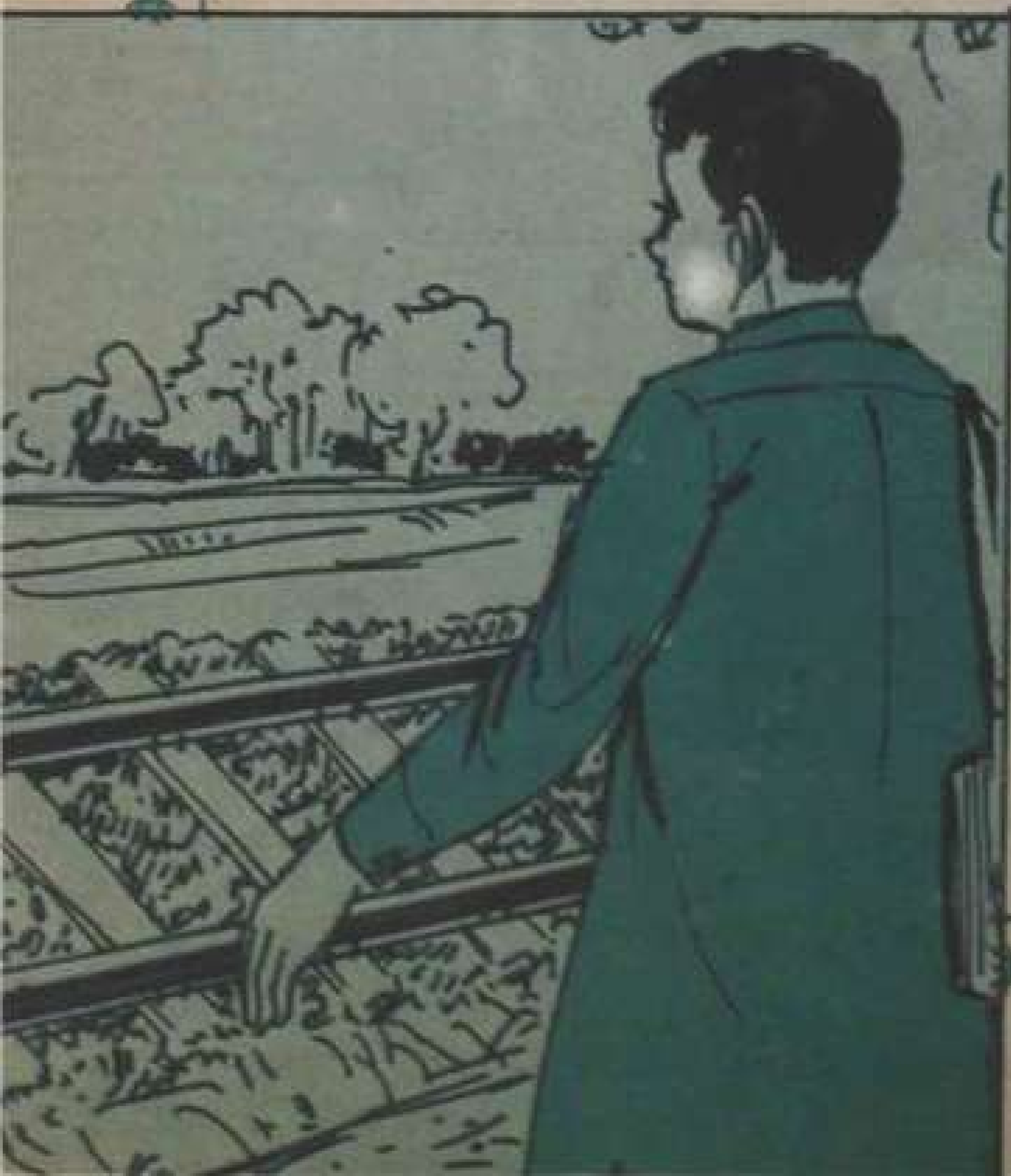
نہیں اُڑائیں گے۔

ہم وہاں تو نہ پہنچ سکے، جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے، ہاں البتہ وہاں ضرور پہنچ گئے جہاں سے کیمبل پُور ریلوے سٹیشن شروع ہو جاتا ہے۔

بزرگوں نے ہمیں بتا رکھا تھا کہ ریل کی پٹڑی پر سے نہیں گزُرنا چاہیے اِس لیے ہم وہیں پٹڑی کے پاس رُک گئے۔ ٹھیک ہے، بزرگوں نے ہمیں یہ بھی تو بتا رکھا تھا، کہ فیس کے روپوں سے مٹھائی نہیں کھا لینی چاہیئے مگر نہ جانے اس دن یہ بات ہمارے ذہن سے کیوں نکل گئی تھی ورنہ آج ہمیں سکول سے نہ بھاگنا پڑتا۔

ریل کی پٹڑی کے پاس ہی ایک بہت بڑا سایہ دار درخت تھا جس کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں چاروں طرف لٹک رہی تھیں۔ ہم وہیں بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ کیا اِس دُنیا میں ہم سے زیادہ بھی بدنصیب بچّہ کوئی ہو سکتا ہے۔

شروع شروع جب روپوں



نے ہماری جیب میں شور مچایا تھا تو ساری بات کتنی سیدھی سادی لگتی تھی، یہی کہ فیس کے روپوں کی مٹھائی کھا جاؤ اور کل سکول سے وظیفہ لے کر سکول ہی میں فیس ادا کر ڈالو۔ ہم نے سوچا تھا کہ دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں، پانچ کبھی نہیں ہو سکتے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ کبھی کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ وظیفہ اگلے مہینے ملے گا تو ہم جلیبیاں کھانے کا پروگرام بھی اگلے مہینے پر ٹال دیتے۔ اب ذرا سی جلیبیاں کھا لینے کے جرم میں ہم زندگی میں سکول سے پہلی بار غیر حاضر ہوئے تھے اور یہاں ریلوے سٹیشن کے ایک سنسان گوشے میں ایک درخت کے نیچے سکڑے بیٹھے تھے۔

درخت کے نیچے بیٹھنے کے بعد سب سے پہلے تو ہمیں تھوڑا سا رونا آیا۔ پھر یہ سوچ کر ہمیں ہنسی آ گئی کہ یہ جو ہم آنسو بہا رہے ہیں تو یہ آنسو نہیں ہیں، جلیبیوں کے رس کے قطرے ہیں۔ گرم گرم قطرے گرنے سے ہماری نرم و نازک گال جلنے لگی۔



جلیبیوں سے ہمیں فیس اور فیس سے ماسٹر غلام محمد کے ڈنڈے سے خدا یاد آ گیا۔ ہم نے آنکھیں بند کر لیں اور بڑی رِقّت کے ساتھ دعا مانگنے لگے:

"اللہ میاں! ہم بڑے نیک اور فرمانبردار لڑکے ہیں۔ ہمیں پُوری نماز یاد ہے۔ قرآن مجید کی آخری دس سُورتیں بھی ازبر ہیں۔ آپ چاہیں تو ہم سے پوری آیۃ الکرسی ابھی اور اِسی وقت سُن لیجیے۔ عرض فدوی کی یہ ہے کہ یہ جو ہم نے فیس کے روپوں کی جلیبیاں کھا لی ہیں تو چلیے ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہو گئی۔ ویسے ہم نے یہ جلیبیاں اکیلے ہی تو نہیں کھائی تھیں، اتنے بہت سے بچّوں کو بھی کھلائی تھیں۔ لیکن خیر، چلیے ہو گئی غلطی۔ اگر ہمیں یہ پتہ ہوتا کہ سکول سے وظیفہ اگلے مہینے ملے گا تو ہم جلیبیاں نہ کھاتے اور نہ دُوسروں کو کھلاتے۔ ٹھیک ہے جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب آپ یُوں کیجیے کہ ہمارے بستے میں چار روپے رکھ دیجیے۔ چار



روپوں سے ایک پیسہ بھی کم ہُوا تو ہم آپ سے رُوٹھ جائیں گے۔ ہاں! ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہم نے فیس کی رقم سے پھر کبھی مٹھائی کھائی تو جو چور کی سزا، وہ ہماری سزا۔

اے اللہ میاں جی! بس آج ہماری مدد فرما دیجیے!! آپ کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ ہمارا چپڑاسی تک ہر مہینے پندرہ بیس روپے لے جاتا ہے تو اللہ جی! ہم تو آخر ایک بڑے افسر کے بھتیجے ہیں، کیا آپ ہمیں چار روپے بھی نہیں دیں گے؟"

دُعا مانگنے کے بعد ہم نے پُوری نماز، قرآن مجید کی آخری دس سورتیں، آیۃ الکرسی، کلمہ طیّبہ، درود شریف، غرض وہ سب کچھ پڑھ ڈالا جو ہمیں یاد تھا۔ پھر ہم نے اپنے بستے پر "چھُوہ" کی، اور بسم اللہ کہہ کر جب ہم نے بستہ کھولا تو بھئی سچ کہا تھا کسی نے قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے، بستے میں چار روپے چھوڑ



چار پیسے بھی نہیں تھے ۔ بس چند کتابیں اور چند کاپیاں تھیں۔ ایک پنسل تھی ۔ ایک پنسل تراش تھا اور ایک عدد پُرانا عید کارڈ تھا ، جو ہمارے ماموں نے ہمیں پچھلی عید پر بھیجا تھا۔ زور زور سے رو دینے کو جی چاہا ، مگر پھر اچانک خیال آیا کہ سکول میں چھُٹی ہو گئی ہو گی اور بچّے گھروں کو جا رہے ہوں گے ۔ ہم تھکے ہارے وہاں سے اُٹھے اور بازار میں آ کر سکول میں چھُٹی کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگے تاکہ بچّے نکلیں تو ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے گھر یُوں پہنچیں جیسے سیدھے سکول سے آ رہے ہیں۔

ہمیں یہ خیال ہی نہ آیا کہ ہم جلیبیوں والے حلوائی کی دکان کے پاس کھڑے ہیں ۔ اچانک حلوائی کی آواز آئی :



"کیوں بھئی ! تولوں ایک روپے کی ؟ کیا آج تم جلیبیاں نہیں کھاؤ گے ؟"

جی میں آئی اِس سے کہہ دیں کہ جلیبیاں تو خیر نہیں کھائیں گے ۔ ہاں آج ہم تمھارا کلیجہ بھُون

کر کھانا چاہتے ہیں، مگر اس روز ہماری طبیعت کچھ علیل سی ہو رہی تھی۔ اس لیے آگے بڑھ گئے۔

دُوسرے دن بھی ہم نے یہی کیا۔ گھر سے تیار ہو کر نکلے سکول کے گیٹ تک آئے اور وہاں سے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اِسی درخت کے نیچے بیٹھ کر وہی دعائیں پھر مانگنا شروع کر دیں۔ بار بار عرض کیا کہ "اللہ میاں! آج تو دے دیجیے۔ آج تو دُوسرا دن ہے۔"

پھر کہا: "اچھا تو آئیے، ایک مزے کا کھیل کھیلیں۔ ہم یہاں سے اس سِگنل کی طرف چلے جاتے ہیں۔ آپ چُپکے سے اِس بڑے سے پتھّر کے نیچے چار روپے رکھ دیجیے۔ ہم سِگنل کو چھُو کر واپس آئیں گے اور یہ پتھّر اُٹھا کر دیکھیں گے تو نیچے چار روپے پا کر لُطف آ جائے گا تو پھر تیار ہو جائیے، ہم چلے سِگنل کی طرف۔ وَن۔ ٹو۔ تھری۔

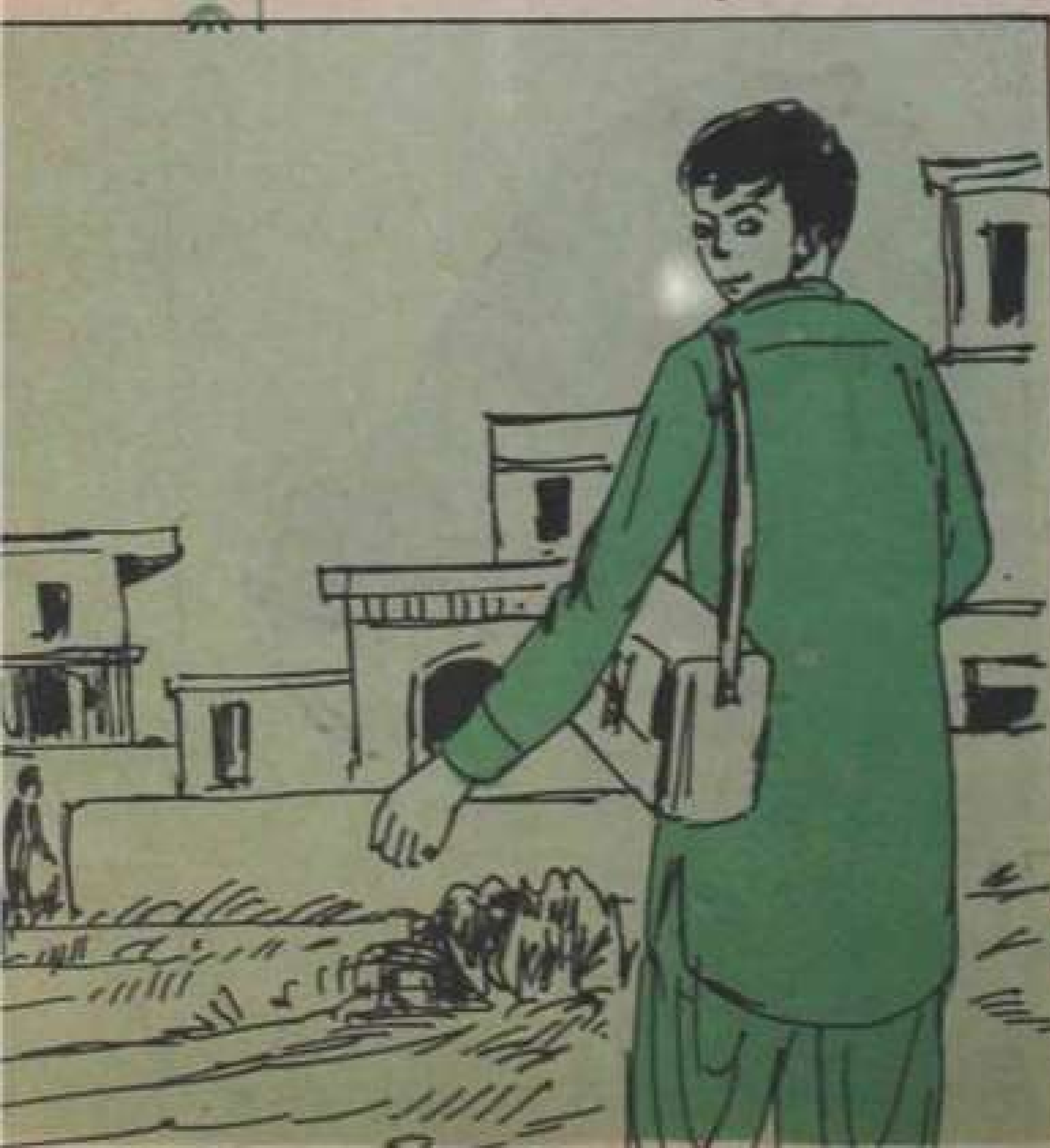
ہم سِگنل تک گئے۔ مُسکراتے ہُوئے واپس آئے مگر وہ پتھّر اٹھانے کا حوصلہ نہ ہُوا۔ اگر پتھّر کے نیچے



سے روپے نہ نکلے تو؟ پھر سوچا اگر نکل پڑے تو؟.....

آخر ہم نے بسم اللہ پڑھ کر پتھر کو زور لگا کر جو اٹھایا تو نیچے سے ایک یہ لمبا بالوں بھرا کیڑا بَل کھاتا ہُوا اُٹھا، اور ہماری طرف بڑھا۔ ہم چیخ مار کر بھاگے اور ایک بار پھر سگنل کو چھُو آئے۔ پھر کچھ دیر کے بعد پنجوں کے بَل چلتے ہم درخت کے نیچے پہنچے۔ پُوری کوشش کی کہ ہماری نظریں اس پتھر کی طرف نہ اُٹھیں مگر جب ہم وہاں سے بستہ اُٹھا کر چلے تو پتھر کی طرف ایک بار دیکھنا ہی پڑ گیا اور پتہ ہے وہاں ہم نے کیا دیکھا؟ ہم نے دیکھا کہ وہی کیڑا صاحب پتھر کے اُوپر کُنڈلی مارے بیٹھے ہیں اور ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم وہاں سے یہ سوچ کر چلے کہ کل وضو کر کے اور صاف کپڑے پہن کر یہاں آئیں گے اور صبح سے دوپہر تک نمازیں ہی پڑھتے رہیں گے۔ اس پر بھی خدا نے ہمیں چار روپے نہ دیے تو پھر کِسی سے چِلّہ کاٹنے کا طریقہ سیکھیں گے۔ آخر ہمیں



چار روپے ہمارا خدا نہیں دے گا تو اور کون دے گا۔ چچا جان نے ہمیں چار روپے دینے تھے. وہ تو ہمیں دے چکے۔ اب خدا کے سوا ہمارا کون ہے؟

مگر اس دن ہم ظاہر میں سکول سے اور اصل میں ریلوے سٹیشن سے گھر واپس پہنچے تو پکڑے گئے۔ سکول سے ہماری غیر حاضری کی رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ یہ بتانا فضول ہے کہ اس کے بعد کیا ہُوا۔ صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ اس کے بعد وُہی ہُوا جو ہوتا ہے۔ یعنی ایک کے دو دو دکھائی دیتے ہیں اور دن کو تارے نظر آنے لگتے ہیں۔

وہ تو جو ہُوا سو ہُوا لیکن ساتویں آٹھویں جماعت تک، ہم یہی سوچتے رہے کہ اگر اس روز اللہ میاں ہمیں چار روپے بھیج دیتے تو کسی کا کیا بگڑ جاتا۔ اس کے بعد ہی ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ اگر اللہ میاں یونہی مانگنے پر دے دیا کرتے تو انسان آج بھی چیل کوؤں کی طرح درختوں میں گھونسلے بنائے بیٹھے ہوتے اور اب تک انھوں نے جلیبی بنانے کا فن بھی نہ سیکھا ہوتا۔

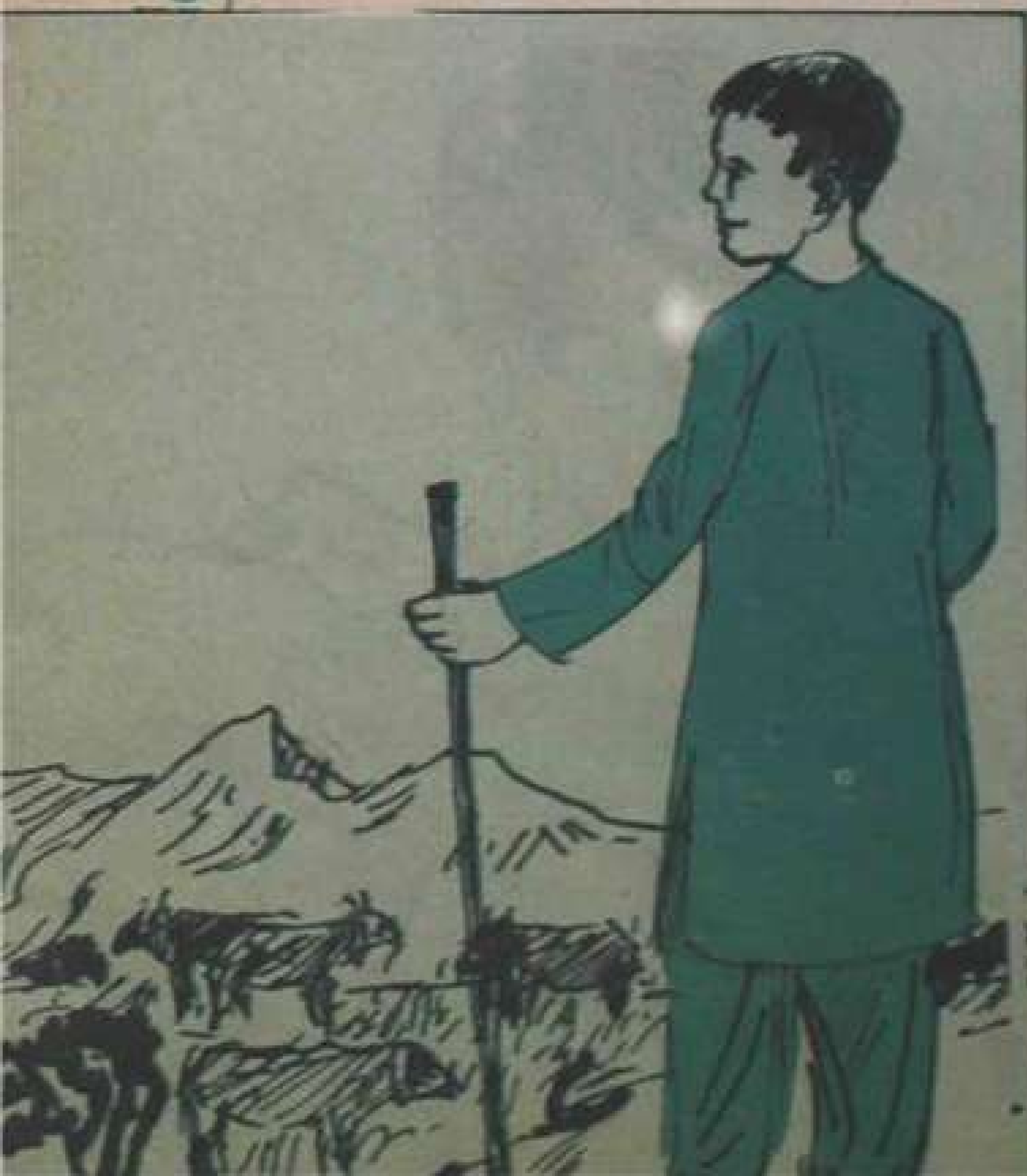




کرشن چندر

بڑکن

جب شامو کو پتہ چلا کہ اُس کے گاؤں کے نمبردار چرن سنگھ کے گھر ڈاکہ پڑا ہے، اور ڈاکو مال اور دولت کے علاوہ نمبردار کے اکلوتے بیٹے ساونت کو بھی اُٹھا کر لے گئے ہیں، اور اب ڈاکو، ساونت کے باپ سے لڑکے کو واپس کرنے کا ایک ہزار روپیہ مانگ رہے ہیں تو شامو یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ کیونکہ نمبردار کا بیٹا ساونت جس کی عمر تقریباً دس سال کی تھی، بہت ہی مغرور لڑکا تھا۔ وہ اکثر شامو کو، "بڑکن" کہہ کر چڑایا کرتا تھا، کیوں کہ شامو کے کان بڑے بڑے تھے اور وہ ذات کا چمار تھا اور گیارہ سال کا ایک غریب لڑکا تھا اور دن بھر گاؤں کے باہر جنگل کے کنارے نمبردار کا ریوڑ چرایا کرتا تھا۔ شام کے وقت



ریوڑ کو جنگل سے واپس لا کر نمبردار کے مویشی خانے میں بند کر کے اپنے گھر واپس جاتے ہُوئے ساونت کو اپنے گھر کے باہر گاؤں کے دُوسرے لڑکے اور لڑکیوں سے کھیلتے دیکھ کر اُسے اکثر غصّہ آجاتا تھا، کیوں کہ ساونت اور اس کے دوست اور سہیلیاں شامو کو اپنے ساتھ کھیلوں میں شریک نہیں کرتے تھے اور اس کے بڑے بڑے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے اُسے "بڑکنّا" ـــ "بڑکنّا" کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اُس کے پیچھے چیختے چلّاتے ہُوئے بھاگتے تھے۔

ایک بار تو نمبردار کے بیٹے ساونت نے جوش میں آکر اُسے ایک پتّھر بھی مار دیا تھا، جس سے شامو کا ماتھا پھَٹ گیا تھا۔ اور اس میں سے خُون نِکل آیا تھا۔ یہ بہت دِن پہلے کی بات ہے، مگر آج بھی شامو کے ماتھے پر اُس زخم کا نشان موجُود ہے۔



اِس لیے جب شامو کو جنگل کے کنارے ریوڑ چَراتے ہُوتے یہ پتہ چلا کہ ڈاکو دن دھاڑے ہلّہ بول کر نمبردار کے گھر سے اس کے

بیٹے ساونت کو اُٹھا کر لے گئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ کم بخت مغرور لڑکا! اپنے باپ کی نمبرداری پر کیسا اکڑا پھرتا تھا اور مجھے چمار کا بیٹا سمجھ کر مجھ سے سیدھے مُنہ بات تک نہیں کرتا تھا! اب مزا آئے گا اُسے۔

شامو نے اپنے کُتّے رنگلو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"تم کو معلوم ہے رنگلو! یہ چرن سنگھ نمبردار، میری ماں کو گاؤں کے کنوئیں سے پانی نہیں بھرنے دیتا ہے اور میری ماں بے چاری کو گاؤں سے باہر ڈیڑھ میل کی پہاڑی گھاٹی چڑھ کر پہاڑی چشمے سے پانی لانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی میری ماں کھیتوں میں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہے اور اس کے بعد اسے گھر کا کام بھی سنبھالنا پڑتا ہے تو پانی کے لیے خود مجھے گاؤں سے ڈیڑھ میل جانا اور ڈیڑھ میل آنا پڑتا ہے اور تم تو ایک سمجھ دار کُتّے ہو، رنگلو! تم کو تو معلوم ہے کہ دن بھر ریوڑ کو چرانا کتنا مشکل کام ہے، اس وقت پانی کا ایک گھڑا لانے کے لیے ڈیڑھ میل



پہاڑی پر چڑھنا اور پھر اُترنا کتنا مشکل کام ہے اور کتنا بُرا لگتا ہے۔ تم تو جانتے ہو رنگلو! ایک دفعہ مَیں نے جب گاؤں کے کنوئیں پر کسی آدمی کو نہ دیکھ کر وہاں سے ایک گھڑا بھر لیا تھا، تو کم بخت ساونت نے کہیں سے مجھے دیکھ ہی لیا تھا۔ پھر اُس نے اپنے باپ چرن سنگھ سے شکایت کر کے مجھے کتنا پٹوایا تھا۔ اچھا ہُوا مغرور چھوکرے کو ڈاکو اُٹھا کر لے گئے۔ بھگوان کرے وہ اُسے دو دن تک بھوکا پیاسا رکھیں۔ تب مجھے چین آئے گا!"

رنگلو اپنے مالک کی باتیں سُن کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ اُس نے کان کھڑے کیے۔ تیز نگاہ سے ریوڑ کی طرف دیکھا۔ پھر ایک بکری کو جنگل کے اندر جاتے دیکھ کر اُسے روکنے کے لیے بھونکتا ہُوا بھاگا۔ کُتّے کی آواز سُن کر بکری جنگل کے اندر جاتے جاتے واپس آ گئی۔



"مگر ساونت کو اِن ڈاکوؤں نے رکھا کہاں ہو گا؟" شامو نے رنگلو سے پُوچھا۔ مگر رنگلو کی نظر اب

اُن دو بکروں پر پڑی جو اپنا سر نیچا کر کے لڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ رنگلو فوراً اُنھیں ایک دُوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھونکتا ہُوا بھاگا۔ رنگلو بہت سمجھ دار کتّا تھا اور ریوڑ کی رکھوالی میں ہر طرح اپنے مالک کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

"اور بے چارہ نمبردار چرن سنگھ کہاں سے ایک ہزار روپیہ دے گا؟" شانو نے خوش ہو کر رنگلو سے پُوچھا۔ "بے شک وہ گاؤں کا سب سے امیر آدمی ہے، ٹھاکر ہے، نمبردار ہے مگر ایک ہزار روپیہ بھی تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تم کو معلوم ہے، رنگلو ایک ہزار روپیہ کتنا ہوتا ہے؟"

"بھوں! بھوں!" رنگلو نے کہا۔ یعنی، "مجھے کیا معلوم؟ مجھے بھیڑ بکریاں چَرانے سے ہی کہاں فُرصت مِلتی ہے؟ اور دُوسری بات یہ ہے کہ روپیہ پیسہ گِن کر ایک کرے گا بھی کیا؟ یہ سب مصیبتیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں، انھیں گِننا پڑتا ہے، سکول جانا پڑتا ہے، کھیتوں میں کام کرنا پڑتا ہے اور ڈیڑھ میل دُور سے پانی لانا پڑتا



ہے ۔ بھوں ! بھوں !!"

"تم سمجھتے نہیں ہو رنگلو"۔ شامو نے اپنے کتّے سے کہا۔
"ایک ہزار روپیہ بہت ہوتا ہے ، یُوں سمجھو کہ ہمارے ریوڑ میں تین بیسی بکریاں ہیں اور دو بیسی بھیڑیں ہیں اور کُل مِلا کے پانچ بیسی ہوئے ، یعنی ایک سو ۔ اب ایک سو سے دس گُنے زیادہ ریوڑ میں ایک ہزار کی گنتی ہو گی ۔ سمجھ گئے ایک ہزار روپیہ کتنا ہوتا ہے ؟ یعنی ـــــ سمجھ گئے نا ؟"

" بھوں ، بھوں ، بھوں !" رنگلو اپنی لمبی زبان نکال کر سَر ہلانے لگا ۔ گویا کہہ رہا ہو " لعنت بھیجو جی ایک ہزار روپے پر ۔ اب شام ہو رہی ہے ، اور اندھیرا بھی بڑھتا جا رہا ہے ۔ چلو گھر چلیں ۔ مُجھے بُہت بھُوک لگ رہی ہے !"

" بھُوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے !" شامو نے رنگلو کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا ۔" اِس لیے آج جلدی گھر چلتے ہیں ۔ چرن سِنگھ اپنے بیٹے کے غم میں آدھا ہو رہا ہو گا ۔ پچاس بیسی روپیہ کہاں سے



لائے گا۔ ڈاکوؤں کو دینے کے لیے؟ چار چھ بیسی کی بات ہوتی تو بندوبست کر لیتا، مگر پچاس بیسی کہاں سے لائے گا؟ چلو ذرا چل کر اُس کی صُورت دیکھیں!"

واقعی نمبردار چرن سنگھ اپنے اکلوتے بیٹے ساونت کے غم میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ جب شامو اور رنگلو، ریوڑ سمیٹ کر مویشی خانے میں اُسے داخل کر کے باہر آئے تو اُنھوں نے چرن سنگھ کو اپنے گھر کے باہر ایک چارپائی پر غم سے نڈھال سر جھکائے بیٹھا دیکھا۔ اُس کا حُقّہ اس کے قریب ٹھنڈا پڑا تھا۔ چارپائی کی پٹّی سے لگ کر ساونت کی ماں پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی تھی۔ شامو کا دل چرن سنگھ کو اداس دیکھ کر تو بہت خوش ہُوا، مگر ساونت کی ماں کو روتے دیکھ کر اور اپنے بیٹے کے غم میں سسکتے دیکھ کر اس کے دل سے ساری خوشی کافور ہو گئی، اور پھر آپ ہی آپ اس کا دل بھر آیا۔



"تم میرے سارے زیورات بیچ دو، مگر میرے بچّے کو ڈاکوؤں سے چھُڑا دو، ورنہ میں مر جاؤں

گی !" ساونت کی ماں روتے ہوئے بولی۔

"تمھارا زیور ہے ہی کتنا ؟" چرن سنگھ نے غصّے سے کہا۔ "سونے کی ایک ہی تو کیل ہے۔ باقی سب زیور چاندی کا ہے۔ دو سو روپے کا بھی نہیں ہو گا !"

"سارا زیور بیچ دو !"

"گاؤں میں ہماری بھیڑ بکریاں خریدنے والا کون ہے ؟ اور تو مجھ سے بھی غریب ہیں۔" چرن سنگھ بولا۔ "بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی کا ٹھکانہ ہوتا ہے ! اور وہ ڈاکو کہتے ہیں کہ دو دن کے اندر اندر ایک ہزار روپے دے دو، ورنہ ساونت کو مار ڈالیں گے۔"

"ہائے میرا لال !" ساونت کی ماں دوہتّڑ اپنے سینے پر مار کر چیخی اور بَین کرنے لگی۔

ساونت کی ماں کو روتے دیکھ کر شامو کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ خاموشی کے ساتھ سَر جھکائے اپنے کُتّے کو ساتھ لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔



"ساونت کو مار ڈالیں گے؟ یہ تو بہت بُرا ہو گا رنگلو!" شامو نے اپنے کُتّے سے کہا۔ "پھر مَیں ساونت سے بدلہ کیسے لے سکوں گا؟ ساونت سے بدلہ لینے کا حق تو صرف مجھے ہے!"

کتّا خاموشی سے زمین سُونگھتا ہُوا دھیرے دھیرے اپنے مالک کے ساتھ چل رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک جھاڑی کے پاس جا کر رُک گیا اور زور زور سے بھونکنے لگا اور دُم ہلا ہلا کر جھاڑی کے گرد چکّر لگانے لگا۔

"کیا ہے رنگلو؟" شامو نے ذرا غصّے سے اپنے کُتّے سے کہا۔ "یہ کھیلنے کا وقت نہیں ہے، بھُوک لگی ہے، سیدھے گھر چلو!"

مگر کُتّا زور زور سے بھونکتے ہُوئے جھاڑی کے گِرد چکّر لگاتا رہا، آخر شامو پریشان ہو کر جھاڑی کے پاس پہنچا اور جھاڑی کے اندر نظر دوڑا کر دیکھنے لگا۔

اس کا خیال تھا کہ جھاڑی کے اندر کوئی خرگوش ہو گا۔

مگر اندر تو خرگوش نہیں تھا۔ کانٹے دار جھاڑی کی شاخوں میں ایک جُوتا پھنسا ہُوا تھا۔



شامو نے اُسے اٹھا کر حیرت سے دیکھا۔ شاید جب ڈاکو ساونت کو اُٹھا کر لے جا رہے ہوں گے، تو یہ جُوتا اس کے پاؤں سے نکل کر اس جھاڑی میں گر گیا ہو گا۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا رنگلو، کہ ڈاکو ساونت کو لے کر اسی راستے سے گئے ہیں!"

شامو نے رنگلو کو وہ جوتا سُونگھایا۔ جوتا سونگھ کر رنگلو، بالکل دیوانہ سا ہو گیا اور زور زور سے اپنے مالک کے گِرد چکّر لگانے لگا اور ہوا میں سُونگھ کر نتھنے پھُلا کر جنگل کی طرف بار بار لپکنے لگا۔

"سیدھے گھر چلو!" شامو بولا۔ "مجھے بھُوک لگی ہے۔"

"بھوں، بھوں، بھوں!" رنگلو نے دانتوں سے اپنے مالک کی قمیض کے دامن کو پکڑ لیا اور اُسے آہستہ سے گھسیٹتے ہُوئے جنگل کی طرف چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔

"معلُوم ہوتا ہے، ڈاکوؤں نے ساونت کو جنگل میں ہی کہیں چھُپا کے رکھا ہے!" شامو بولا۔ "مگر ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنا آسان



کام نہیں ہے۔ تم نہتے ہو۔ مَیں نہتا ہوں اور اُن ڈاکوؤں کے پاس بندوقیں ہوں گی، سمجھتے ہو!"

مگر رنگلو، تو جیسے کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اس نے جُوتا سونگھ لیا تھا اور اُسے سُونگھ کر وہ بے قرار ہو گیا تھا اور بار بار شامو کو جنگل کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔

"اچھا بھئی چلو، جنگل ہی کو چلتے ہیں۔" شامو نے رنگلو سے کہا۔ "آگے جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ اُس مغرور لڑکے پر تو مجھے ترس نہیں آتا، لیکن اُس کی ماں پر مجھے بہت ترس آتا ہے..... مگر دیکھو رنگلو، ڈاکو بڑے خطرناک ہوتے ہیں اِس لیے جنگل میں بھونکنا مناسب نہیں ہے۔ خاموشی سے چلو، ورنہ گولی کھاؤ گے اور جان سے جاؤ گے۔ تم بھی اور مَیں بھی!"



کُتّے نے چرواہے کی بات سمجھ لی اور اب رنگلو تیز تیز قدموں سے زمین سُونگھتا ہُوا گاؤں سے باہر نکل گیا اور ایک پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے لگا۔ پہاڑ کی گھاٹی پار کر کے وہ ایک ریتیلی وادی میں

پہنچے جہاں ریت کے درمیان جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہُوئی تھیں۔

یکایک ایک جھاڑی سے ایک خرگوش نکل کر بھاگا۔ رنگلو نے دُور تک اُس کا پیچھا کیا، مگر خرگوش اپنے بِھٹ میں جا کر چھُپ گیا۔ رنگلو بِھٹ کے باہر زور زور سے بھونکنے لگا اور اپنی پچھلی ٹانگوں سے زمین کھودنے لگا۔

"بڑے احمق ہو رنگلو!!" شامو نے اپنے کُتّے کو گردن سے پکڑ کر کہا۔ "آئے تھے ساونت کی تلاش میں اور تم بھاگنے لگے ہو خرگوش کے پیچھے...... سیدھے سیدھے سُونگھ کر اپنے راستے پر چلو، ورنہ......!"

جب شامو نے رنگلو کے کان پکڑ کر اینٹھے تو رنگلو چُپ چاپ اپنے راستے پر چلنے لگا۔

ایک جگہ ریت کے ایک ٹیلے سے ایک سیہہ نکلی اور کتّا چھلانگ کر ہوا میں اُچھل گیا، اور اس کے ساتھ ساتھ شامو بھی ہوا میں اُچھلا اور سیہہ اپنے بدن

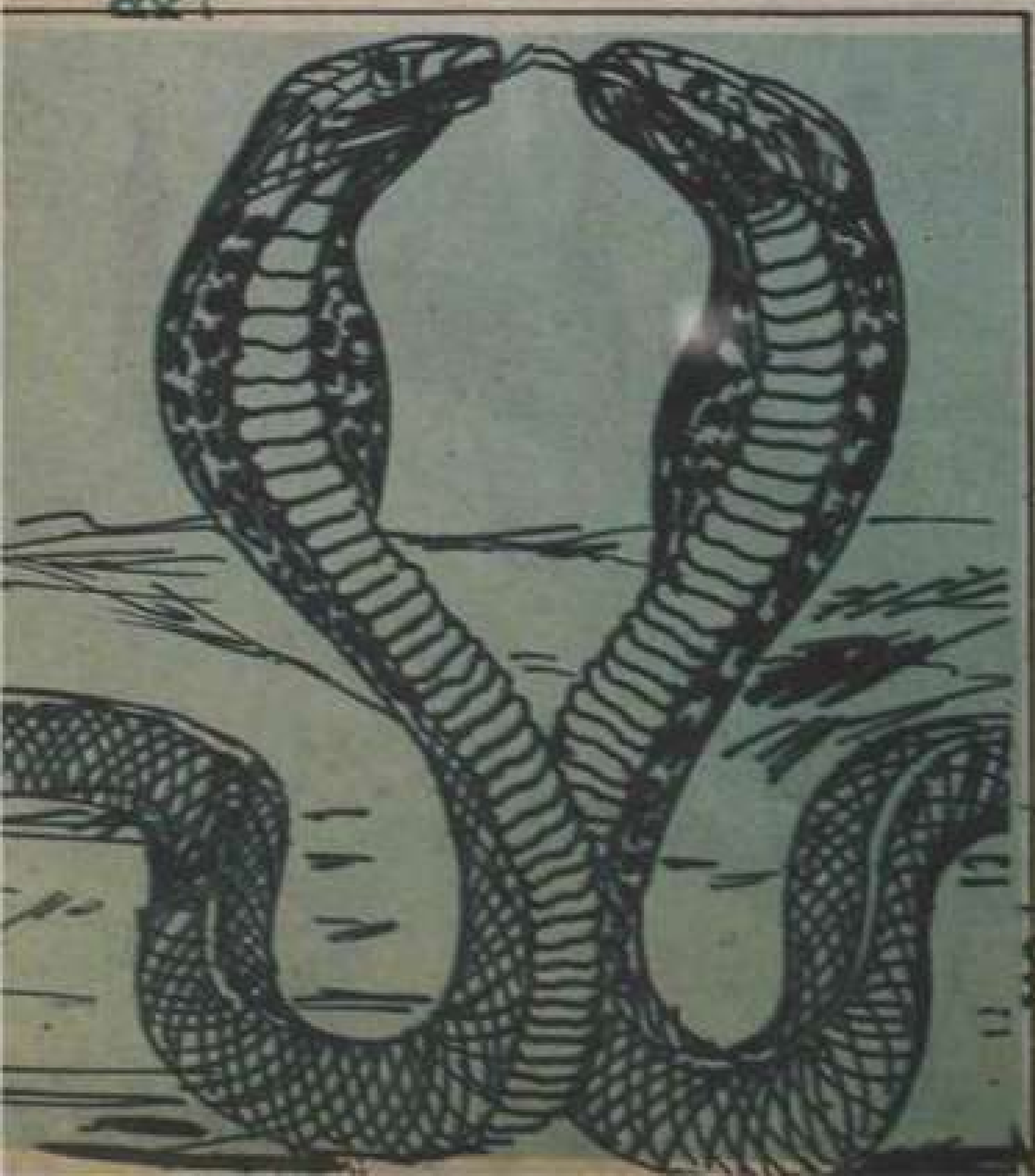


کے تیز نکیلے کانٹے چھوڑتی ہوئی بھاگ گئی۔

"سیہہ کا کانٹا بہت تیز ہوتا ہے دوست!" شامو نے رنگلو سے کہا۔"تم نے عین وقت پر بچا لیا ورنہ ہم دونوں زخمی ہو جاتے۔"

آگے جا کر رنگلو ایک دم خوف کے مارے لرزنے لگا، اور پھر بچّوں کی طرح چُوں چُوں، چُوں چُوں کر کے پیچھے ہٹنے لگا۔ شامو نے آگے بڑھ کر دیکھا تو وہ بھی خوف کے مارے وہیں کا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

ایک ریتیلے ٹیلے کے نیچے دو خوف ناک ناگ اپنے پھَن پھیلائے ایک دُوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اُن کی زبانیں بار بار تیر کی طرح اُن کے مُنہ سے باہر نکلتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی خوف ناک زہریلی پھُنکاریں نکل رہی تھیں۔



چند منٹ تک یہ خوف ناک تماشا دیکھنے کے بعد شامو نے چپکے سے اپنے کُتّے کو پکڑ لیا اور راستہ چھوڑ کر گھُوم گیا۔ کافی دُور تک گھُوم کر وہ چکّر لگا کر پھر دونوں آگے بڑھے، اور ایک

گھنے جنگل میں گھس گئے۔

" اگر یہ دونوں ناگ ہمیں دیکھ لیتے ، زنگلو بھائی ، تو اپنی لڑائی چھوڑ کر وہ ہم دونوں کے پیچھے لگ جاتے۔ وہ تو بھگوان نے بچا لیا اور تم نے عین وقت پر دیکھ لیا۔"

جنگل میں چلتے چلتے رات ہو گئی مگر کتا ابھی تک آگے بھاگا جا رہا تھا۔ کبھی راستے میں رُکتا ، سُونگھتا ، ایک طرف بڑھتا ، لوٹ آتا ، پھر نئی بُو پا کر بڑی بے چینی سے گھومتا اور آگے چلتا۔ چلتے چلتے وہ گھنے جنگل کے بالکل اندر پہنچ گئے ، جہاں ایک اُونچا ٹیلا تھا ، اُس ٹیلے کی نوک دار چٹانوں کے اُوپر ایک چھوٹا سا قلعہ کھڑا تھا۔

اب کتا بڑی بے چینی کے ساتھ سُونگھ سُونگھ کر چٹانوں کے اُوپر چڑھ رہا تھا ، اور شامو اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ قلعے کے دروازے کے اندر پہنچ کر کتا بڑی بے چینی سے ایک کمرے کی طرف بھاگا اور اندر جا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔



شامو بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ فرش پر چند جلی ہوئی لکڑیاں اور اُن کی راکھ پڑی تھی اور رنگلو راکھ میں مُنہ ڈال کر بار بار چھینکتا تھا اور ٹانگوں سے راکھ کرید کرید کر چلاّتا تھا۔

"چُپ رہو!" شامو نے رنگلو کو دھمکایا اور پھر غور سے کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔

کمرے کی ایک دیوار گری ہوئی تھی۔ دُوسری دیوار کے قریب ایک اُونچا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے کے بیچ میں ایک بڑا سا چوکور پتّھر رکھا تھا۔ اس پتّھر پر لوہے کا ایک بڑا ڈنڈا سا لگا تھا اور ڈنڈے کے نیچے پتّھر کے بیچ سے لے کر چبوترے کے نیچے تک ایک گہرا سوراخ تھا.... ایک چھوٹا سا سوراخ جو بالکل اِتنا چوڑا تھا جتنا لوہے کا ڈنڈا۔ شامو نے سُوراخ میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ اس کے اندر کچھ نہ تھا۔ صرف ریت بھری ہوئی تھی۔



شامو نے کُتّے کو لے کر

قلعے میں چاروں طرف چکّر لگایا، مگر اُسے نہ کہیں ساونت مِلا، نہ ڈاکو نظر آئے۔ وہ واپس اسی کمرے میں آکر بیٹھ گیا جہاں چبوترے کے پتّھر پر لوہے کا ڈنڈا لگا تھا اور سوچنے لگا۔

"میرا خیال ہے رنگلو!" شامو نے اپنے کُتّے سے کہا۔ "ڈاکو یہاں سے چلے گئے ہیں۔ شایدَ پچھلی رات کو یہیں رہے ہوں گے، اس کمرے میں انھوں نے آگ جلائی ہو گی، اب وہ آگے کہیں چلے گئے ہیں، سمجھے!"

کتّا کان لپیٹ کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار ہوا میں کچھ سُونگھ کر رہ جاتا تھا۔ کان کھڑے کرتا تھا، پھر گرا کر اپنی تھوتھنی کو زمین پر مایوسی سے رکھ دیتا تھا۔

"میرے خیال میں رات یہیں گزاریں، رنگلو!" شامو نے کُتّے کو مشورہ دیا۔ صُبح واپس چلیں گے۔ خواہ مخواہ تم نے گھمایا یہاں تک، ساونت بھی نہ ملا!"

کتّا کان لپیٹے لیٹا رہا۔

شامو مایوس ہو کر لوہے کے ڈنڈے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہاتھ



پھیرتے پھیرتے اُس نے ڈنڈے کو چبوترے میں بنے ہُوئے سُوراخ ٥
کی طرف گھُمانے کی اچانک کوشش کی تو یکایک اس کے کانوں میں ایک عجیب سی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ اُس نے بڑے غور سے اِدھر اُدھر دیکھا، تو سامنے کی دیوار درمیان میں سے شق ہوتی ہوئی نظر آئی۔ وہ زور لگا کر لوہے کے ڈنڈے کو سُوراخ میں گھُمانے لگا۔ آہستہ آہستہ سامنے کی دیوار شق ہوتی گئی۔ اور جب ڈنڈا چبوترے پر آ کر ٹِک گیا تو شامو نے دیکھا، کہ دیوار کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے اور وہاں اُس جگہ ایک زینہ نظر آ رہا تھا۔

شامو نے رنگلو کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور رنگلو نے شامو کی طرف..... مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا، اور دونوں ہی خوف زدہ تھے۔



شامو نے رنگلو سے کہا:

"تم یہیں بیٹھے رہو۔ میں اندر جا کر دیکھ کر آتا ہوں، تم خواہ مخواہ شور کرتے ہو۔"

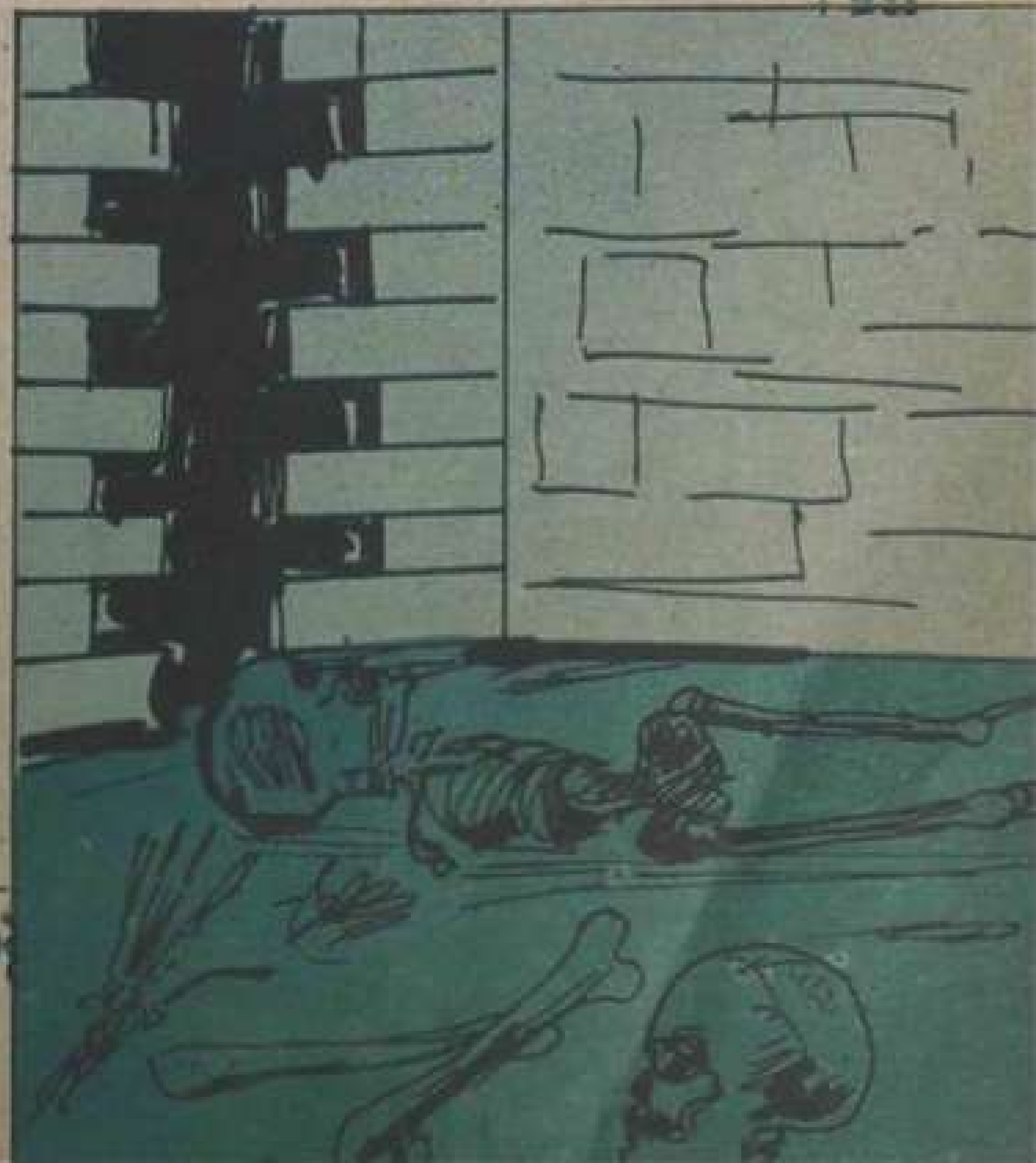
اتنا کہہ کر شامو گھٹنے کو وہیں

چھوڑ کر دھیرے دھیرے خاموش قدموں کے ساتھ زینے سے اُتر کے جب نیچے پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک چوکور کمرہ ہے جس کے اندر انسانی ہڈیوں کے پنجر پڑے ہیں، اور بس کمرے میں کوئی نہ تھا، نہ ڈاکو نہ ساونت!

اچھی طرح چاروں طرف دیکھ کر شامو واپس باہر آگیا اور پھر چبوترے پر اپنے کتّے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔

کافی دیر سوچنے کے بعد شامو نے لوہے کے ڈنڈے کو سوراخ میں اُلٹی جانب گھمانا شروع کیا تو سامنے کی دیوار پھر آہستہ آہستہ بند ہونے لگی اور جب لوہے کا ڈنڈا چبوترے کے چوکور پتّھر کے سرے پر پہنچ گیا تو دیوار بالکل بند ہو گئی۔

شامو بہت حیران ہو رہا تھا اس نے دو تین بار لوہے کے ڈنڈے کو گھما کر یہ عجیب و غریب تماشا دیکھا۔ ہر بار دیوار بیچ میں سے کھل جاتی تھی، دوبارہ گھمانے پر بند ہو جاتی تھی۔



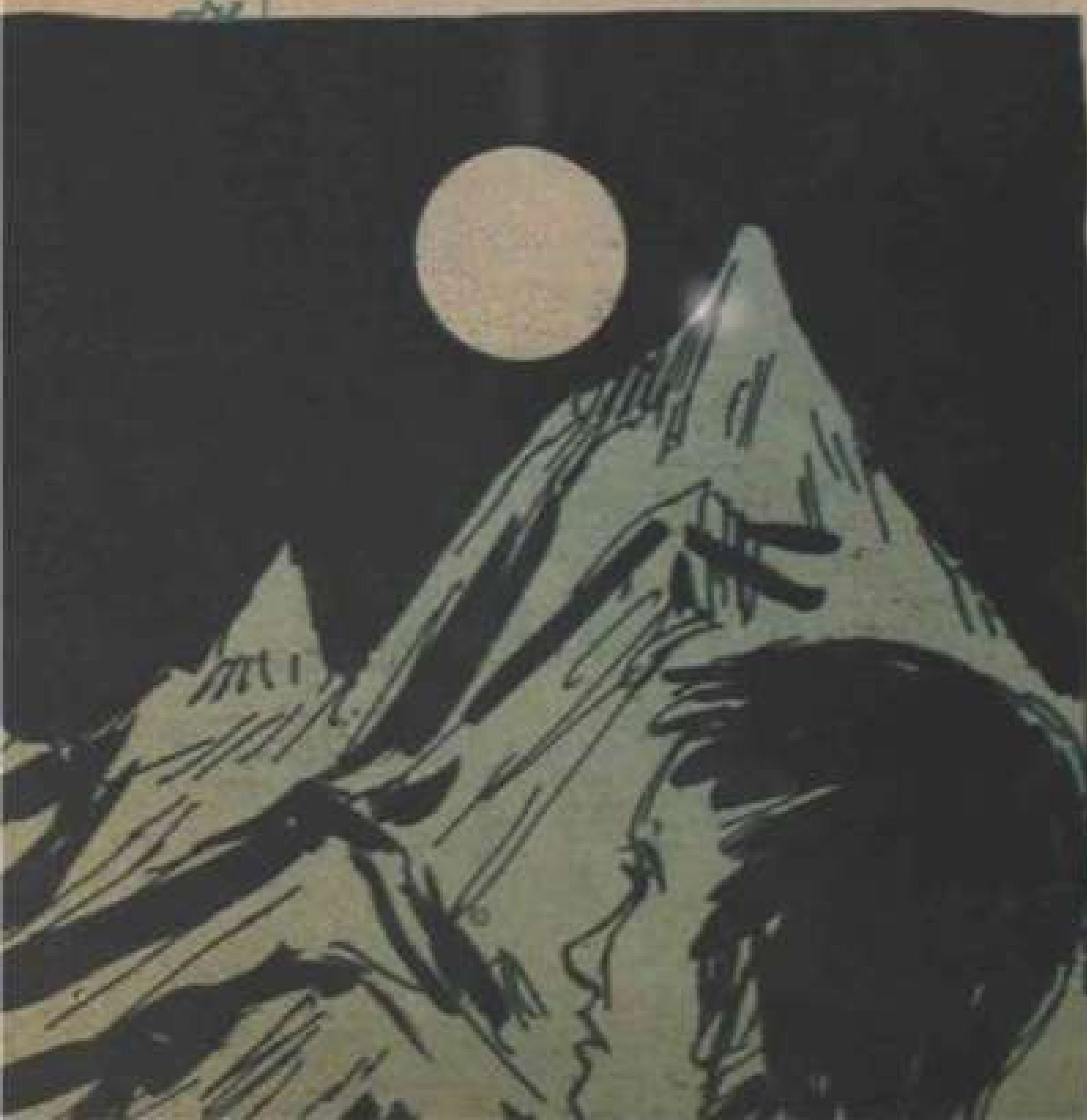
سوچ سوچ کر اُس کے دل میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ اس نے ایک بار پھر ڈنڈا گھما کر دیوار کو بیچ میں سے کھول دیا اور زینے کو کھُلا چھوڑ کر قلعے کے باہر آگیا۔

قلعے سے باہر آنے کے بعد شامو نے اپنے کُتّے کو پھر ساونت کا جُوتا سُونگھایا اور بولا :

"اب اگر تم نے مجھے ڈاکوؤں کے چھُپنے کی جگہ نہ بتائی تو میں تمھیں جان سے مار ڈالوں گا۔ گاؤں سے یہاں تک تو لائے ہو اب آگے کا راستہ بھی دکھاؤ!"

کُتّے نے جُوتے کو بار بار سُونگھا اور پھر چٹانوں سے اُتر کر دکھّن کو ہو لیا۔ شامو بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

چلتے چلتے وہ جنگل کو پار کر گئے اور ایک اُونچی چٹانوں والی پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔



اب چاند بھی نکل آیا تھا، اور اُس کی روشنی میں شامو نے دیکھا کہ پہاڑی پر چٹانیں ہی چٹانیں ہیں اور درخت یا جھاڑی ایک بھی نہیں ہے، جس کے سائے میں چھُپ

کر آگے بڑھا جا سکے۔

پہاڑی کی چوٹی پر شامو کو ایک تاریک گپھا نظر آ رہی تھی۔ جس کے باہر آگ جل رہی تھی اور اس آگ کے پاس چند آدمی بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

کُتا اُن آدمیوں کی طرف مُنہ کر کے بھونکنے والا ہی تھا کہ شامو نے جلدی سے آگے بڑھ کر کتے کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے چُپ کرا دیا۔

"خاموش!" شامو نے آہستہ سے رنگلو کو للکارا۔ "دیکھتے نہیں ہو، پہاڑی کی گپھا کے باہر ڈاکو بیٹھے ہوئے ہیں۔ یقیناً یہ وہی ڈاکو ہیں جنھوں نے ساونت کو اُٹھایا ہے!"

"اب کیا کیا جائے! یہاں تک تو ہم آ گئے ہیں۔ اب آگے کیا کیا جائے؟" شامو نے رنگلو سے کہا اور سوچنے لگا۔



کافی دیر سوچ سوچ کر اُس نے ایک ترکیب ڈھونڈ ہی نکالی پھر وہ آپ ہی آپ مُسکرایا اور اپنے کُتے کو لے کر پہاڑی کی چوٹی

کی طرف بڑھنے لگا۔

شامو نے اپنے کُتّے کو پکڑ رکھا تھا اور وہ آہستہ آہستہ چوٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ابھی انھوں نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ ایک چٹان کے پیچھے سے دو ڈاکوؤں نے اچانک نکل کر اُسے گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

"کون ہو تم، کہاں جاتے ہو؟" ایک ڈاکو نے پُوچھا۔

"تمھارے سردار سے ملنے آئے ہیں!"

"کہاں سے آئے ہو؟" ڈاکو نے ڈانٹ کر پُوچھا۔

"گاؤں سے آیا ہُوں!"

"کیوں؟" دُوسرے ڈاکو نے پُوچھا۔

"مجھے نمبردار نے بھیجا ہے۔ تمھارے سردار سے ملنے کے لیے!" شامو نے جواب دیا۔



ڈاکو، اُسے اپنے سردار کے پاس لے گئے، اُن کا سردار ایک خوف ناک مُونچھوں والا، لمبا تڑنگا

بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں، اور خوف ناک چمک رکھتی تھیں۔

شامو اس ڈاکو کی آنکھیں دیکھ کر پہلے تو بہت ڈرا، مگر پھر اُس نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا :

" مجھے نمبردار چرن سنگھ نے بھیجا ہے۔ وہ اِس وقت جنگل کے قلعے کے اندر ایک ہزار روپے لیے بیٹھا ہے، چل کر لے لو اور لڑکا اس کے حوالے کر دو!"

" اگر تم نے جھوٹ بولا تو......"

" مَیں نہنّا ہُوں اور اکیلا ہُوں۔" شامو نے کہا۔" اگر جھوٹ بولوں تو تم مجھے قتل کر دینا۔"

ڈاکوؤں نے آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ساونت اور شامو کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور جنگل کے قلعے کے اندر پہنچے۔ اسی کمرے کے اندر جہاں انھوں نے آگ جلائی تھی رات کو!



"یہاں تو کوئی نہیں ہے!"

ڈاکوؤں نے کمرے کے اندر پہنچ کر غصّے سے کہا اور ڈاکوؤں کے سردار نے اپنی بندوق شامو کے سینے پر رکھ دی۔

"جھوٹے!" وہ چلّا کر بولا۔

"مَیں جھوٹا نہیں ہوں!" شامو نے سر جھکا کر بڑی نرمی سے کہا۔ "وہ چرن سنگھ اس قلعے میں ہے۔ اس زینے کے نیچے والے کمرے میں بیٹھا ہے۔ ایک ہزار روپیہ لے کر!"

ڈاکو جلدی جلدی زینہ اُتر کر بندوقیں لیے ہوئے نچلے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ یکایک شامو نے جو جان بُوجھ کر پیچھے رہ گیا تھا، ہاتھ کے اشارے سے ساونت کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور جلدی سے اُس نے لوہے کے ڈنڈے پر ہاتھ رکھ کے ساونت سے کہا:

"گھماؤ! تم بھی جلدی سے زور لگا کر لوہے کے ڈنڈے کو میرے ساتھ گھماؤ۔ جلدی کرو، ڈاکو واپس نہ آ جائیں۔"



لوہے کا ڈنڈا، زور زور سے گھومنے لگا اور پھر چبوترے کے

سوراخ میں بڑھنے لگا۔ اس کے بڑھتے ہی بڑے زور کی گڑگڑاہٹ شروع ہوئی۔

ڈاکوؤں نے پلٹ کر جو دیکھا تو زینے کے پیچھے کی دیوار کو بند ہوتے دیکھ کر واپس دوڑنے لگے، مگر جب تک وہ دیوار تک پہنچے، لوہے کا ڈنڈا پورا سوراخ میں گھس کر چبوترے پر گر چکا تھا، دیوار بند ہو چکی تھی۔ اور ڈاکو قید ہو چکے تھے۔

دوسرے دن گاؤں کا نمبردار چرن سنگھ شامو کے ساتھ پولیس کے سپاہیوں کا ایک بڑا جتھا لے کر پرانے قلعے میں گیا۔ سارے ڈاکو گرفتار کر لیے گئے۔ شامو کو اس کی بہادری پر سرکار نے انعام دیا اور چرن سنگھ نے گاؤں کا کنواں چماروں کے لیے کھول دیا۔ اب شامو اور ساونت ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مزے سے کھیلتے ہیں مگر ساونت اب بھی شرارت سے کبھی کبھی شامو کو بڑکنا کہہ دیتا ہے اور شامو بھی ساونت سے لڑ کر اس کے کان زبردستی کھینچ کر لمبے کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

